برصغیر کے نامور مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات: ایک مطالعہ

شہزاد چنا*

ABSTRACT:

Education plays an important role in the development of a society. When we talk about Islam and its teachings we see that Islam itself emerges from the word 'Iqra'. That's why education has an immense value in Islam Education strengthen the minds so that people may easily learn to deal with the challenges they face throughout the life. Chronologically from Ashab-e-Suffa to Muslim scholars and educationists of Sub-continent emphasized the process of education with proper training and highlight its importance in Islamic perspective. This paper narrates the educational concepts of five outstanding intellectuals, thinkers and educational philosophers of Sub-continent.

تعلیم کے افادی پہلو کو کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا گیا۔لیکن یہ افادی پہلو ہمیشہ متنوع اور رنگارنگ افکار کی آماجگاہ بنا رہا۔ ہر قوم نے اپنے مخصوص ماحول، معاشی، سیاسی و معاشرتی پس منظر میں اس افادی پہلو کا تعین کیا۔کبھی تعلیمی افادیت کا دائرہ وقت کے محدود تصور کے گرد گھومتا رہا۔کبھی تعلیمی ترقی کا انحصار مادی حوالے سے جانچا گیا اور کبھی تعلیم کو تعمیر کردار کا اہم اور کارگر حربے کے طور پر اختیار کیا گیا۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کہ مخصوص نقطہ ہائے نظر کے تحت تعلیم کا سماجی نظام میں ہمیشہ ایک نمایاں مقام رہا ہے۔

اسلامی حوالے سے تعلیم کے عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علم ہمارے دین کا محوری نقطہ ہے اور اسلام کی ساری تعلیمات اسی سرچشمہ سے پھوٹتی ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم ایک جزوی یا ذیلی سا شعبہ نہیں بلکہ پورے نظام حیات پر محیط ہے۔فلاسفہ اسلام نے تعلیم کو ہمیشہ اسی تناظر میں رکھا اور اسے صرف بعض مہارتوں پر دسترس حاصل کرنے یا کائنات میں ایک مؤثر مقام حاصل کرنے اور مادی طور پر توانا بننے کی کوشش قرار نہیں دیا۔ ان کے ہاں تعلیم ایک مستقل مکتب فکر نظر آتا ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو عام طور پر انفرادی کردار کی عظمت، سائنسی شعور وادراک نشوونما، تسخیر کائنات کے عظیم محرک اور قرب خداوندی کے لیے ایک اہم ذریعے کا درجہ دیتے ہیں۔

مسلم مفکرین نے تعلیم کی نظریاتی اساس پر بڑا زور دیا ہے اور نصاب سازی کے تمام مراحل میں ان اساسی نکات کو

* ڈاکٹر، اسسٹنٹ پروفیسر، دعوۃ اکیڈمی (سندھ ریجن)، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

برقی پتا: shahzadchanna@yahoo.com
تاریخِ موصولہ: ۱۵/مارچ ۲۰۱۴ء

اولین اہمیت دینے کی تلقین کی ہے۔اسلام نے انسان اور کائنات کے حوالے سے جو نظام حیات تجویز کیا ہے۔وہی ایک زبردست قوت محرکہ ہے جو ہمارے تعلیمی نظام کو نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انبیاء الہامی ہدایات کے پیغامبر تھے اور تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں بطور معلم مبعوث ہوئے۔ان معلمین نے جہاں آسمانی ہدایات کو عام کیا وہاں تعمیر انسانیت کا فرض عظیم بھی سرانجام دیا۔ذیل میں ہم برصغیر کے چند ایسے ہی مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات کا جائزہ پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہؒ کے تعلیمی نظریات

اورنگزیب (۱۶۵۸۔۱۷۰۷ء) کے عہد کے ایک فاضل شاہ ولی اللہؒ (۱۱۱۴۔۱۱۷۶ھ بمطابق ۱۷۰۴ء۔۱۷۶۲) تھے۔انھوں نے علم الکلام کو بہت ترقی دی۔غزالی کی طرح شاہ ولی اللہ اسلامی اصولوں کی تشریح فلسفہ سے کرتے ہیں۔ان کے مطابق اسلام کے پائندہ اصولوں کی تشریح عوام کی سبک دلیلوں سے نہیں ہوسکتی۔فلسفہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم سے اسلام میں رفعت پیدا ہوجائے گی اور شاہ ولی اللہؒ کو یقین ہے کہ اسلام تمام عقلی دلائل کے مقابلے میں سچا مذہب ثابت ہوگا۔ انھوں نے دین کے سرچشمہ حقیقی قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے عوام کے لیے قابل فہم بنایا۔

شاہ ولی اللہ اپنے زمانے کے ایک بڑے محدث بھی تھے،انھوں نے ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کئی سال عرب میں تحصیل احادیث میں گزارے۔انھوں نے اپنی کتاب الجزء اللطیف (آپ کی مختصر سوانح عمری ہے) میں ایک نصاب لکھا ہے جو شاہ ولی اللہ کی نگاہ میں تعلیم کا بہترین نصاب ہے۔اورنگزیب کے عہد میں عربی کا یہی نصاب سمجھنا چاہیے۔شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ”عہد عالمگیری میں شیخ عبدالحق محدث اور شاہ ولی اللہ کے پایہ کا کوئی عالم نظر نہیں آتا۔بادشاہ کی علم نوازی اور قدر دانی سے علم وفضل کو بے حد فروغ ہوا۔اور درس علوم اسلامی نے بڑی وسعت اختیار کی۔درس نظامیہ عالمگیر کی وفات کے کئی سال بعد مدون ہوا لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدریس نظامیہ کہلاتا ہے، عالمگیر نے ہی فرنگی محل لکھنو کی عالیشان عمارت مدرسہ کے لیے عطا کی۔اس طریق تعلیم میں جو کتابیں برصغیر کی رائج ہیں ان کا اکثر حصہ عہد عالمگیری میں لکھا گیا۔اور وہ بھی بادشاہ کے منظور نظر علما کے قلم سے۔یہ کہنا بیجا نہیں کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا۔اور دین کا جو احیا ہوا، اس کی بنیاد عہد عالمگیری میں رکھی گئی۔“(۱)

پروفیسر سید محمد سلیمؒ کہتے ہیں کہ:”شاہ ولی اللہؒ نے علم حدیث کو ہندوستان میں عام کیا۔حدیث کی چھ مستند کتابوں صحاح ستہ کا یہاں چلن عام کیا۔ان کو نصاب تعلیم میں شامل کیا۔یہ ان کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہر دینی مدرسہ میں صحاح ستہ کی

تعلیم ہورہی ہے۔فکری لحاظ سے شاہ صاحب کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دین کا مجموعی مربوط تصور پیش کیا۔اس کو ایک نظام حیات بنا کر پیش کیا۔اور اس کو فکری بنیادوں پر استوار کیا۔اس طرح آنے والی عقلی اور فکری کاوشوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔بعد کے تمام اہل علم ان کے نقطۂ نظر کی پیروی کرتے ہیں۔'' (۲)

اورنگزیب کے عہد کے بعد ہندوستان کی فضا میں عام انحطاط شروع ہو گیا۔مولوی نظام الدین (۱۱۶۱ھ۔۱۷۴۸ء) فرنگی محل لکھنو میں رہتے تھے۔انہیں اُس وقت کا بڑا معلم مانا جاتا ہے۔ان کی وفات ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں لکھنو میں ہوئی۔ انھوں نے ایک نصاب تجویز کیا جو درسِ نظامیہ کہلاتا ہے۔وہ تھوڑی بہت ردوبدل کے ساتھ آج تک دیسی مکاتیب میں مروج ہے۔اس نصاب کو شیخ محمد اکرام اس طرح بتاتے ہیں:

۱) صرف: میزان۔منشعب۔صرف میر۔پنج گنج۔زبدہ،فصول اکبری۔شافیہ۔
۲) نحو:نحو میر۔شرح مائتہ عامل۔ہدایۃ النحو۔کافیہ۔شرح جامی۔
۳) منطق:صغریٰ۔کبریٰ۔ایساغوجی۔تہذیب۔شرح تہذیب۔قطبی مع میر سلم العلوم۔
۴) حکمت:میبذی،صدرا۔شمس بازغہ۔
۵) ریاضی:خلاصۃ الحساب۔تحریر اقلیدس مقالہ اول۔تشریح الافلاک۔رسالہ قوشجیہ۔شرح چغمنی باب اول۔
۶) بلاغت:مختصر معانی،مطول تاما انا قلت۔
۷) فقہ:شرح وقایہ اولین۔ہدایہ آخرین
۸) اصول فقہ:نورالانوار۔توضیح تلویح۔مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)
۹) کلام:شرح عقائد نسفی۔شرح عقاید جلالی۔میر زاہد۔شرح مواقف۔
۱۰) تفسیر:جلالین۔بیضاوی(۳)۔

درس نظامی کے معنی وہ نصاب ہے جو ملا نظام الدین سہالوی نے تجویز کیا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ نصاب نظامیہ کالج بغداد میں پڑھایا جاتا تھا۔یہ نصاب اس اصول پر بنایا گیا کہ مشکل اور معیاری کتاب مرکزی مطالعہ کے لیے ہو۔باقی کتابیں اس کی امداد وتشریح اور بصیرت کے لیے جب ہم نصاب تعلیم کی عہد بہ عہد تبدیلیوں پر غور کرتے ہیں اور مقصد تعلیم کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا علوم منقول سے ہٹ کر علوم معقول کی طرف جارہی ہے جہاں دلیل،سبب اور نتیجہ کو زیادہ دخل ہے، جہاں انسان اپنے فکر،فراست اور تجویز سے اپنا نقشہ خود بناتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے اپنی دنیا خود آباد کرلیتا ہے۔

سر سید احمد خان کے تعلیمی نظریات

سر سید احمد خان (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) یوں تو سبھی کچھ تھے مگر ان کو ماہر تعلیم کہنا زیادہ موزوں ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بہت کم مفکرین ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہوں۔ سر سید احمد خان ان میں سے ایک تھے۔ سر سید بنیادی طور پر سوشل ریفارمر تھے اور قومی اصلاح کے لیے وہ تعلیم کو سب سے اہم حربہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم ہر قومی مرض کا علاج اور ہر زہر کا تریاق ہے۔ اس ایک عمل سے ہزاروں روگ ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم و تربیت سے آراستہ قومیں نہ صرف زندہ رہتی ہیں بلکہ ہر درپیش چیلنج کا مقابلہ کر کے ترقی کی منازل طے کرتی چلی جاتی ہیں اور جو قومیں تعلیم سے منہ موڑ لیتی ہیں جہالت انہیں تباہی کے گڑھوں میں دھکیل دیتی ہے۔ مغربی اقوام کی کامیابی کا راز صرف اور صرف تعلیم ہے۔

اسی لیے سر سید احمد خان کی ابتدائی خدمات کے حوالے سے موج کوثر کے مصنف لکھتے ہیں:

”تصنیف و تالیف کے علاوہ سر سید کا دوسرا محبوب مشغلہ اشاعت تعلیم تھا اور سرکاری ملازمت کے زمانے میں بھی انھوں نے یہ شغل جاری رکھا۔ سب سے پہلا مدرسہ جو انھوں نے جاری کیا، مراد آباد کا فارسی مدرسہ تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء میں قائم ہوا۔ دوسرا اسکول جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، غازی پور میں ۱۸۶۴ء میں شروع ہوا، لیکن ان دونوں مدرسوں سے زیادہ اہم کام جو انھوں نے علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے شروع کیا وہ سائنٹیفک سوسائٹی غازی پور کا افتتاح تھا، جو ۱۸۶۳ء میں ہوا۔ اس سوسائٹی کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے، سوسائٹی کے مربی تھے اور ممالک شمال مغربی اور پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نائب مربی، یہ سوسائٹی غازی پور میں شروع ہوئی تھی۔ پھر سر سید کے علی گڑھ منتقل ہو جانے کے بعد سوسائٹی بھی وہاں منتقل ہوگئی۔ اس کے زیر اہتمام مختلف علمی مضامین پر تقریریں ہوا کرتی تھیں اور اس نے کئی مفید کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ ایک اخبار بھی جاری کیا، جس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔ اخبار کے بیشتر مضامین ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح پر مشتمل تھے۔ جب تک سر سید علی گڑھ رہے، سوسائٹی اور اخبار کا انتظام ان کے ہاتھ میں رہا، لیکن جب وہ ۱۸۶۷ء میں بنارس منتقل ہوئے تو راجہ جے کشن داس نے تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بنارس میں بھی سوسائٹی اور اخبار سے سر سید کی دلچسپی برقرار رہی اور اپنے سفر انگلستان کے حالات وہ اس اخبار کو بھیجتے رہے۔“ (۴)

چنانچہ سر سید احمد خان نے برصغیر میں تعلیمی ادارے کے قیام سے پہلے بچشم خود انگلستان کا نظام تعلیم مشاہدہ کیا۔

انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ انگلستان والوں کی عظمت کا راز لامحالہ تعلیم ہے۔ انھوں نے اپنی کم مائیگی پر سخت ماتم کیا۔ مگر کمر ہمت باندھ کر مسلمانوں کے لیے تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کیا۔ گویا اہمیت کے لحاظ سے سرسید نے تعلیم کو اوّلیت دی۔

ہمارے خیال میں تعلیم کی مقصدیت کے بارے میں سرسید کے الفاظ، روز روشن کی طرح واضح ہیں وہ اپنی قوم کو اقوام مغرب کے مقابلے میں مہذب، شائستہ اور باوقار بنانا چاہتے تھے انہیں مسلمانوں کی علم سے دوری سخت ناگوار تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بہترین سائنس دان ادیب، صحافی، شاعر، فلسفی، موجد، ڈاکٹر، انجینئر، جنرل، پروفیسر، اسکالر اور بیرسٹر ہوں اور انھیں لوگوں کے دل جیت لینا آتے ہوں۔ وہ آداب جہاں بانی سے واقف ہوں۔ دنیا والے ان پر رشک کریں۔ وہ کسی خاص قسم کی تعلیم کے حق میں نہ تھے۔ بلکہ ایک ایسی متوازن تعلیم چاہتے تھے جو بقول ان کے ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالہ الا اللہ کا تاج سر پر۔''

سرسید احمد خان سے پہلے ہندوستان میں زیادہ تر پرائیویٹ تعلیم کا رواج تھا۔ مسجدوں کے مولوی حضرات بچوں کو عربی، فارسی زبان اور دینی معلومات فراہم کرتے تھے کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو امتحان لیتا یا ڈگری دیتا۔ ملازمتیں بھی صلاحیت کی بنیاد پر ملتی تھیں، عموماً والدین ہی بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ تعلیم میں زبان، حساب، منطق، فلسفہ، طب اور مذہبی معلومات شامل تھیں اس کے علاوہ کوئی موضوع نہیں تھا۔ البتہ خوش خطی کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ ہر چیز کو زبانی یاد کرنا مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ قرآنِ مجید حفظ کرنا بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا تھا۔ باقاعدہ مدارس نہیں تھے نہ ہی باقاعدہ استاد وطلبہ تھے غیر نصابی سرگرمیوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سرسید احمد خان نے اس طریقہ تعلیم کو فرسودہ اور بیکار قرار دیا، کیونکہ یہ طریقہ جدید تقاضے پورے نہیں کرسکتا تھا۔ اگرچہ سرسید نے خود بھی تعلیم اسی طریقہ سے حاصل کی۔ بعد میں کچھ عرصہ دلی کالج میں پڑھے۔ مگر سرسید اس طریقہ تعلیم کو انتہائی ناکافی خیال کرتے تھے۔ پرانے وقتوں میں پھر بھی اس کی کچھ اہمیت تھی۔ لیکن انگریزوں کے آنے کے بعد یہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا۔ جب کہ جدید طریقہ تعلیم سے مراد اہل برطانیہ کا طریقہ تعلیم تھا۔ جس کے مطابق تعلیم باقاعدہ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں دی جاتی تھی۔ یہ تعلیم ہمہ گیر تھی۔ اس میں زبان ادب، تاریخ، سیاست، معاشیات، حساب، ادیان، فلسفہ منطق، صحافت، فزکس کیمسٹری، قانون، طب، انجینئرنگ غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو نہ صرف انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی تھی بلکہ تحقیق اور جستجو سے نئی نئی ایجادات وجود میں لاکر بنی نوع انسان کی تہذیب وثقافت کو چکا چوند کر رہی تھی۔

سرسید احمد خان نے دونوں طریقہ ہائے تعلیم کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ دونوں میں موازنہ کیا تو دونوں ہی کسی حد تک مفید تھے۔ مثلاً قدیم طریقہ تعلیم سوائے معمولی معلومات کے اور کچھ نہ دیتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے والا دقیانوسی، قدامت پرست

اور لکیر کا فقیر بن جاتا تھا۔نئی نئی اشیاء اور نئے نئے تجربات سے خائف تھا۔ بلکہ نئی ایجادات کو کفر سمجھتا تھا۔اس سے انسان توہم پرست اور مافوق العادت باتوں کا قائل ہوجاتا تھا۔اس میں انقلابی روح بیدا نہیں تھی۔جب کہ جدید طریقہ تعلیم انسان کو دہریت کی طرف لے جارہا تھا۔ایک خاص قسم کی تہذیب وثقافت تو ترقی کررہی تھیں۔مگر اخلاق وآداب کو گھن لگتا جارہا تھا۔آزاد خیالی کے نام پر ان اجنبی خیالات کو تعلیم کا جز اور لادینیت اس کا طرۂ امتیاز تھیں۔

سرسید نے دونوں کو نقصان دہ کہا ہے۔وہ دراصل قدیم وجدید کو اس طرح ضم کرنا چاہتے تھے کہ ان کے نقائص سے بچا جائے اور فوائد سے بہرہ ور ہوا جائے۔وہ مذہبی اور سائنسی تعلیم دونوں کو ضروری خیال کرتے تھے اسی لیے ایک ہاتھ میں فلسفہ دوسرے میں سائنس اور سر پر لا الٰــہ کا تاج رکھنا چاہتے تھے۔ان کے نزدیک مذہبی تعلیم انسان کے کردار کو بناتی ہے اور دنیوی تعلیم اسے ہنرمند بنا کر دنیا میں زندگی آسان کردیتی ہے۔اگر کسی ایک کو چھوڑ دیا جائے تو اعتدال نہیں رہتا۔

سرسید احمد خان کے نزدیک تعلیم میں سب سے اہم کردار استاد کا ہے۔استاد نئی نسل کے لیے ایک نمونہ ہونا چاہیے۔کیونکہ، بچے میں عادات نقل کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔وہ استاد کو کردار کے لحاظ سے اپنا آئیڈیل خیال کرتا ہے۔اگر استاد کا ذاتی کردار اعلیٰ ہو تو شاگرد خود بخود اس کے مطابق ڈھلتے جائیں گے۔سرسید احمد خان نے استاد کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہو اور جانتا ہو کہ اس کے علم سے کس طرح دوسرے مستفید ہوسکتے ہیں۔سرسید استاد کو بہت بڑا علامہ نہیں دیکھنا چاہتے۔صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ بچوں کو ضرورت اور معیار کے مطابق زیادہ سے زیادہ علم دے سکے۔استاد کا کام صرف پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ شاگرد کے کردار کو اجاگر کرنا اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تلاش کرنا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ہے۔اسے بچوں جیسا پیار دینا تاکہ طالب علم استاد کو اپنا ہمدرد اور شفیق خیال کرے۔مگر شاگردوں سے بہت زیادہ بے تکلف ہونا بھی درست نہیں۔حجاب کی ایک ہلکی سی دیوار درمیان میں حائل رہنا دونوں کے مفاد میں ہے۔کیونکہ استاد کے رعب، دبدبے اور عظمت کا تصور شاگرد کے ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

سرسید کے نزدیک طالب علم کو تعلیم کے عمل میں مرکزی کردار حاصل ہے۔یہی وہ اصل جوہر ہے جس کی خاطر سب کچھ ہونا چاہیے۔غرض تعلیمی عمل کی روح رواں اور نصب العین طالب علم ہے سرسید نے طالب علم کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ اگرچہ عملی زندگی میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔لیکن طالب علم کا جو آئیڈیل ان کے تصور میں تھا، اگر کسی نے وہ حاصل کرلیا ہے تو وہ دنیا میں آفتاب بن کر چمکا ہے۔

سرسید کے نزدیک طالب علم اپنے مقصد تعلیم سے آگاہ ہونا چاہیے۔اس کے سامنے واضح نصب العین ہونا ضروری ہے۔جس کے لیے وہ سب کچھ کررہا ہے۔طالب علم کی ذہانت کو ایک قدرتی عطیہ خیال کرتے ہیں لیکن محنت کو وہ اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت، لگن، توجہ اور دلچسپی بھی ضروری ہے۔

وہ طالب علم کو صحت مند، چاق و چوبند دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ میں کھیلوں وغیرہ کا معقول انتظام کیا ان کے نزدیک ورزش جسم کے لیے ہی نہیں ذہن کے لیے بھی صحت کا پیغام ہے۔ وہ طالب علم کی جہاں آزادی کے قائل تھے وہیں ان کی ہمہ وقت نگرانی بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اقامتی اداروں پر زیادہ زور دیا تاکہ طلبہ کی ہمہ وقت نگرانی ہوتی رہے اور ان کی زندگی منضبط ہو جائے۔ وہ طالب علم کو چپ چاپ گم سم اور ان سوشل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علم ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہوں۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلباء سے انہیں بہت انس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طلباء دوران تعلیم سب کچھ حاصل کریں۔ یہاں سے فارغ ہو کر نکلیں تو ہر لحاظ سے کامیاب زندگی بسر کریں۔ وہ طلباء میں مقابلے کی اسپرٹ پیدا کر کے ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا بہتر سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے انعامات اور وظائف کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ طلباء کو معاشی مسائل سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نادار طلباء کو ہر لحاظ سے خود کفیل کر دیا تھا۔ کمیٹی ہی ان کے تمام اخراجات برداشت کرتی تھی۔

سرسید کے نزدیک تعلیمی عمل میں تیسرا رکن درس گاہ ہے۔ درس گاہ دراصل ایک فیکٹری کا کام دیتی ہے۔ جہاں صنعت کے لیے ہر قسم کا سامان یعنی مشینری، انجینئر، مٹیریل وغیرہ مہیا کر کے مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بغیر صنعت کا عمل ناممکن ہوتا ہے۔ وہ درس گاہ کو صرف ضروری ہی خیال نہیں کرتے بلکہ اسے خوب صورت کشادہ ہر قسم کے سامان سے پر، موسم کی شدت سے تحفظ کے عین مطابق، بلند و بالا عمارت اور شایان شان فرنیچر سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے، جہاں دیواروں پر بہترین رنگ و روغن سامنے کشادہ تختہ سیاہ، ہوادار کھڑکیاں غرض ہر سہولت بہم موجود ہو۔ سرسید کا خیال تھا کہ درس گاہ کی عمارت پر جتنا خرچ کیا جاسکے کرنا چاہیے۔

انھوں نے آکسفرڈ یونیورسٹی کی عالی شان عمارت کا نقشہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا اور اسی نمونہ پر علی گڑھ میں عمارت کی تعمیر کا آغاز کیا تو لوگوں نے انہیں دیوانہ قرار دیا۔ مگر وہ دھن کے پکے تھے۔ اپنے کام میں مگن رہے۔ اللہ کا نام لے کر ایک بلند و بالا صاف ستھری اور پر وقار عمارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے نزدیک عمارت کی خستہ حالی، گندگی، تنگی اور کم مائیگی طلباء کے کردار پر اچھا اثر نہیں کرتی۔ اس لیے عمارت کو عالی شان ہونا چاہیے۔

سرسید نے تعلیم کے لیے تعلیمی ماحول کی موجودگی ضروری قرار دی۔ کیونکہ ماحول کا اثر اذہان پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تعلیمی ماحول سے ان کی مراد یہ ہے کہ ہر شخص تعلیم کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ ہر طالب علم اپنے آپ کو تعلیمی ماحول میں ضم کرے۔ استاد ہمہ وقت تحقیق و تدریس میں مصروف رہیں۔ سوائے تعلیم کے کام کے کسی اور طرف توجہ نہ ہو۔ اگر ماحول غیر تعلیمی ہو تو تعلیم کا اثر زائل ہو جاتا ہے پڑھا لکھا چند روز جہلاء کی محفل میں بیٹھے تو اچھا خاصا جاہل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید طلباء کو باقی معاشرے سے کاٹ کر ایک خالص تعلیمی معاشرے سے وابستہ کرنا چاہتے تھے تاکہ باہر کے اثرات

طلباء پر اثر انداز نہ ہوں اور یہاں کے ماحول کا اثر زائل نہ ہو۔

ان کے نزدیک ہمہ وقت کیڑے کی طرح کتابوں میں گھسے رہنا بھی ایک غیر صحت مند سرگرمی سے کم نہیں۔ وہ زندگی کو متوازن دیکھنا پسند کرتے تھے انھوں نے باقاعدہ پروگرام مرتب کیا تھا۔جس میں کھیل کے وقت کھیل، آرام کے وقت آرام، پڑھائی کے وقت پڑھائی، غیر نصابی سرگرمیوں کے وقت غیر نصابی سرگرمیاں۔ اس طرح انھوں نے ایک جامع ماحول تخلیق کیا۔جس میں طلبہ کی شخصیت کے ہر گوشے کو اجاگر کیا جارہا تھا۔طلبا ادبی کام بھی کرتے تھے۔ بحث مباحثے، مشاعرے، ڈرامے بلکہ موسیقی کی محفلیں تک منعقد ہوتی تھیں۔ سیر و سیاحت بھی ہوتی تھی۔طلبا کو نئی چیزیں بنانے کے مواقع بھی میسر تھے۔اس کے ساتھ ساتھ طلباء باقاعدہ نماز باجماعت پڑھتے تھے۔رمضان کے مہینے میں روزے رکھتے تھے۔مذہبی تہوار مناتے تھے۔

سرسید لباس کی سادگی اور صفائی پر زور دیتے تھے۔وہ لباس کے بارے میں بہت زیادہ قدامت پسند نہیں تھے۔شلوار، کرتہ، شیروانی کے علاوہ اگر کسی نے سوٹ نکٹائی پہن لی تو اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود انگریزی لباس پہنتے تھے اور اس معاملہ میں وہ بالکل آزاد خیال تھے البتہ فیشن پرستی کے خلاف تھے۔وہ طلبا میں سادگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سرسید کے نزدیک تعلیم کو تربیت میں بدل دینا ضروری ہے۔صرف معلومات حاصل کر لینا مقصد نہیں بلکہ ان معلومات کو عملی طور پر اپنانا ضروری خیال کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے ایسے افراد کی ضرورت نہیں جو کہنے کو تو علامہ ہوں مگر اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کر سکتے ہوں، وہ علم سے زیادہ عمل پر زور دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فن شناس نہیں بلکہ فن کار پیدا کرنے پر زور دیا ہے وہ طلبا سے عملی کام کرانا پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا علم بے کار ہے جو انسان کو بہتر زندگی گزارنے کے ہنر نہ سکھائے۔اسی نظریہ کے پیش نظر انھوں نے ہر طالب علم کو کوئی ہنر سکھانے پر زور دیا تھا تاکہ عملی زندگی میں ان کے کام آئیں۔

سرسید احمد خان کے تعلیمی نظریات پر جمال پانی پتی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سرسید احمد خان کی تعلیمی پالیسی کے ان خوشگوار نتائج کے باجود ہم اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ سرسید کا تعلیمی پروگرام ہی تھا، جس کی بدولت ایک طرف مسلمانوں اور انگریز حاکموں کے درمیان بڑھتی ہوئی بے اعتمادی کی خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہوئے اور دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کو اس کے ذریعہ اپنے وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند کی حالت اس قدر ابتر اور ان کے حوصلے اس قدر پست تھے کہ سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یہ سرسید اور ان کے رفقائے کار ہی تھے جن کی کوششوں کی بدولت ان میں پھر سے جینے کا حوصلہ پیدا ہوا اور وہ ایک پر اعتماد اور منظّم قوم بن کر ابھرے۔" (۵)

اس کے برعکس نامور دانشور نعیم صدیقی، سرسید کے تعلیمی نظام کے حوالے سے اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک نگاہ عمیق وسیع ڈال کر اگر جامع طور پر دیکھا جائے کہ علی گڑھ کی تعلیم نے علمی، معاشرتی اور معاشی رویے کیا پیدا کیے تو وہ بہت واضح ہیں۔(۱) قول وفعل میں تضاد اور اسلام کے بارے میں مداہنت بلکہ لاپروائی اور بے تعلقی، (۲) دوں ہمتی اتنی کہ اگر کسی نے اسلام کا کام کرنا بھی چاہا تو یہ احتیاط برتی کہ اسلام کا نام کہیں سامنے نہ آئے۔لوگوں میں نکو بن جانے سے لے کر تھانے میں رپٹ درج ہونے کا اندیشہ (۳) مغربی فکر اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور مسحوریت (بلا جرأت اختلاف وتنقید) ادھر کسی اصول یا روایت وقدر کا انکار، (۴) مادہ پرستی اور دنیا پرستی۔

ایسے علی گڑھ کے شاخساروں میں الحاد، لادینیت اور کمیونزم اور ترقی پسندی نے خوب اپنے گھونسلے بنائے اور انڈوں بچوں کی پرورش کی۔جو اسلام سے وابستہ رہے بھی وہ مسلمانی بلا اسلام اور ایمان بلا عمل، اور سیاست ومعاش بلا اخلاق اور تحریک بلا منصوبہ مستقبل، مجہول روش کے لوگ تھے (کچھ لوگ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں)۔یہ تھا علی گڑھ جس نے تحریک پاکستان کو سپاہی فراہم کیے جن میں ملحد اور کمیونسٹ اور اسلام بلا علم کے علمبردار سبھی بڑی اکثریت کے ساتھ شامل ہوئے۔''(۶)

سرسید احمد خان نے تعلیم کے ساتھ صحافت اور ادب کے حوالے سے بھی رہنمائی کی۔انھوں نے صحافت اور ادب کی تربیت کے لیے'' تہذیب الاخلاق علی گڑھ گزٹ'' اور ''علی گڑھ میگزین'' وغیرہ کا بندوبست کیا۔جن میں طلباء کے مضامین چھپتے تھے۔سرسید لیڈرشپ کے لیے تربیت ضروری خیال کرتے تھے۔ہر مفکر کا اپنا پروگرام ہوتا ہے۔کوئی سیاسی ترقی پر زور دیتا ہے کوئی سماجی ترقی پر لیکن سرسید اپنے پروگرام کو زندہ رکھنے کے لیے فن شناس نہیں فن کار پیدا کرنا چاہتے تھے۔جو آنے والے حالات کے خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں۔

علم حاصل کرنے کے لیے زبان کا سہارا درکار ہے۔جب تک کسی ایسی زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔جس میں وہ علم تحریر ہے۔اس وقت تک علم کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔اس سلسلہ میں دنیا بھر کے مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ مادری زبان ہی وہ زبان ہے جس پر ایک انسان مکمل عبور حاصل کرسکتا ہے۔اگر اس زبان میں علم پڑھایا جائے تو طالب علم جلد سمجھ لیتا ہے اور جلد مافی الضمیر کا اظہار کرسکتا ہے۔یہ سب ٹھیک ہے مگر سرسید اس پر ایک شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ مادری زبان ترقی یافتہ ہو اس کا سرمایہ الفاظ وادب بے پایاں ہو۔اس میں ہر قسم کے خیالات الفاظ کا جامہ پہن سکتے ہوں اور علوم بھی اس زبان میں لکھے جاچکے ہوں۔

اگر کوئی غیر ترقی یافتہ مادری زبان ہو تو اس میں علم کا حصول بہت مشکل ہوجاتا ہے۔خاص طور پر اگر علم کسی دوسری زبان میں ہو تو پھر اسے مادری زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل ہوجاتا ہے۔اس قسم کا ترجمہ پڑھنے میں تو آسان ہوتا ہے

مگراس کی اصل روح ترجمہ میں نہیں سماسکتی۔اس لیے ضروری ہے کہ علم جس زبان میں ہواسی زبان کو پڑھ کر علم حاصل کیا جائے۔ ورنہ اس علم پر دوہری محنت درکار ہوگی۔ مثلاً کیمسٹری کا بیشتر علم انگریزی زبان میں ہے۔مگر مقامی زبان اردو یا فارسی ہے۔اب یا تو انگریزی سیکھ کروہ علم حاصل کیا جائے گا یا اپنی زبان میں ترجمہ کر کے علم حاصل کیا جائے گا۔

سرسید کے نزدیک دوسری صورت مشکل بھی ہے اور غیر مفید بھی۔ان کا خیال ہے کہ جوعلم جس زبان میں ہواسی زبان میں حاصل کرنا بہتر ہے۔اس طرح ایک نئی زبان بھی آجائے گی اور علم بھی حاصل ہوجائے گا۔دوسری صورت میں کافی دقت اٹھانی پڑے گی۔سرسید نے انگریزی زبان میں تعلیم کومفید اور جائز قرار دیا ہے۔ان کا خیال مدلل ہے۔فرماتے ہیں کہ اگر بحراوقیانوس میں لعل و جواہر موجود ہوں تو نکالنے کے لیے وہیں جانا پڑے گا۔بحرہند کی تلاش بے کار ہوگی۔

سرسید نے تعلیم کے دومدارج مناسب قرار دیے ہیں۔اسکول کی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم ،یعنی ابتدائی اوراعلیٰ تعلیم، ان کے نزدیک پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک بنیادی تعلیم ہے جو ہرفرد کے لیے لازمی ہونی چاہیے۔اس درجہ میں کسی ایک یادوزبانوں پر پورا پورا عبور حاصل کرانا ضروری ہے۔معمولی روزمرہ کا حساب کتاب جغرافیہ،تاریخ اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی پیشہ کی تعلیم ضروری ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے۔ یہ سب کے لیے ضروری نہیں صرف ذہین اور اہل طلباء کا حق ہے۔ بنیادی تعلیم تک استادوں اور خود طالب علموں کواچھی طرح معلوم ہوجانا چاہیے کہ کون سا طالب علم کس شعبے کے لیے موزوں ہے۔افتادطبع اور رجحان کے مطابق اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔

سرسید تعلیم میں تخصیص کے قائل ہیں۔کیونکہ ایک ہی فرد ہرقسم کی تعلیم نہ تو حاصل کرسکتا ہےاور نہ ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے بنیادی تعلیم کے بعد طالب علم کو ماہرین کے مشورے سے ایسے علوم حاصل کرنا چاہئیں جن کے ساتھ اسے قدرتی لگاؤ ہو۔جس بھی مضمون کو مطالعہ کے لیے منتخب کیا جائے اس میں کمال حاصل کیا جائے۔

سرسید تعلیم کے سلسلے میں توازن کے قائل ہیں۔ ابتدائی درجہ میں عام تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم ضروری ہے تاکہ طالب علم تعلیم کو صرف حصول معاش ہی کا ذریعہ نہ سمجھ لے بلکہ زندگی کے ہرعمل میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کو پیش نظر رکھے۔دوسری طرف دنیوی علوم سے بھی صرف نظر نہ کرے بلکہ انہیں حاصل کرنے میں پوری تندہی سے کام لے۔ان کے نزدیک تعلیم ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہونی چاہیے۔ان کے نزدیک تعلیم ایک فن ہے،جس میں تحقیق اور جستجو ہوتی رہے تاکہ تدریس کے نئے نئے طریقے سامنے آتے رہیں۔ وہ نفسیات پر بہت زور دیتے تھے کیونکہ زندگی کے ہرشعبے میں اس کا عمل دخل ہوتا ہے۔اس لیے نفسیات کو جاننا ہر تعلیم کے لیے ضروری ہے۔سرسید نے طبی، فنی، زرعی ،سائنسی اور معاشرتی قسم کی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔دوسری طرف ادب، فلسفہ، منطق آرٹ جسمانی تعلیم وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

سرسید کے نزدیک ہرقسم کی تعلیم و تدریس کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔اس سلسلے میں وہ قدیم طریقوں کو بھی بیکار نہیں

سمجھتے اور جدید طریقوں سے بھی انحراف نہیں کرتے، ان کے نزدیک براہ راست تعلیم کا طریقہ زیادہ کارگر ہے۔ ٹرانسلیشن میتھڈ کو انھوں نے مشکل اور طویل کہا ہے۔وہ تدریس کے نظریاتی پہلو کی بجائے عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تدریسی عمل میں سمعی ،بصری معاونت پر زیادہ زور دیا ہے۔کیونکہ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد کردار سازی ہے رکوانا مقصد نہیں۔ وہ تعلیم کو عملی زندگی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔سرسید احمد خان کے نزدیک کوئی مخصوص طریقہ بہتر نہیں تھا بلکہ وہ استاد اور مضمون کی نوعیت اور طلباء کی صلاحیت کے مطابق ڈھل جانے والے طریقے کو بہتر سمجھتے تھے کیونکہ اصل مقصد طالب علم کو سمجھانا ہے، وہ چاہے جس بھی طریقہ سے اچھی طرح سمجھے ویسا ہی طریقہ بہتر خیال کرتے تھے۔

سرسید تعلیمی نصاب کے بارے میں اس بات کے قائل تھے کہ وہ عام فہم اور جامع ہو۔ نہ تو اس قدر طویل ہو کہ طالب علم اکتا جائے اور نہ ہی اس قدر مختصر ہو کہ کچھ پلے نہ پڑے۔ وہ رٹے کے سخت خلاف تھے۔وہ چاہتے تھے کہ طالب علم کچھ جانے صرف نگلے نہیں اور پھر اُگلے نہیں بلکہ دوبارہ اسے ظاہر و تحریر کر سکے۔ وہ نصاب کو محدود کرنے کے حق میں نہیں تھے، بلکہ اسے عام زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے حق میں تھے۔اس لیے انھوں نے علی گڑھ کے حوالے سے ایک جامع نصاب ترتیب دیا جس کے اثرات عملی طور پر اس وقت نظر بھی آئے۔

سرسید کے نزدیک صرف تحریری امتحان طالب علم کی قابلیت جانچنے کے لیے ناکافی ہے۔وہ عملی امتحان کے قائل تھے۔ اس لیے وہ تحریری کے ساتھ زبانی اور عملی امتحان لیتے تھے۔سرسید تعلیم کو حکومت کی گرفت سے آزاد رکھنا چاہتے تھے۔سرسید کے یہ نظریات آج ہر کسی نے تسلیم کر لیے ہیں اور تعلیمی معاملات میں حکومتوں کی دخل اندازی سے جو نقصانات ہوتے ہیں، روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ تعلیم کو قوم کا ذاتی مسئلہ قرار دیتے تھے۔اسی لیے انھوں نے نمونہ کا ایک تعلیمی ادارہ بنایا جہاں اپنی مرضی سے نصاب، امتحان ،نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں، ادبی و ثقافتی تقاریب اور کھیل وغیرہ سب کچھ ضرورت کے عین مطابق ترتیب دیا۔

مجموعی طور پر اگر ہم سرسید کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو اس سلسلے میں مولانا حالی کا بڑا دلچسپ تبصرہ صاحبِ موج کوثر نے رقم کیا ہے، جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری وقت میں سرسید کی اپنے قائم کردہ ادارے کے بارے میں کیا رائے تھی۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''۲۶ برس کے تجربے سے ان کو (سرسید کو) اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی ، فضول اور اعلیٰ لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔'' (۷)

اس کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی جو کہ ابتدا میں سرسید کے علی گڑھ کالج میں عربی کے استاد تھے انھوں نے بھی کالج میں عربی تعلیم کی تحقیر کی جانب توجہ مبذول کروائی اور کہا: ''ارکان کالج سے ایک بڑا نکتہ جو فروگزاشت ہوا اور ہو رہا ہے، وہ یہ

ہے کہ موجودہ طریقہ سے وہ صرف لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے اور کر سکتے ہیں جن کو معاش کی ضرورت نے انگریزی تعلیم پر مجبور کر رکھا ہے اور امرا و رؤسا، جن کو معاش کی فکر نہیں، وہ انگریزی کے واسطے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن اگر انگریزی تعلیم کے ساتھ پورے طور پر عربی اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کیا ہوتا تو علی گڑھ کالج کے احاطہ میں تعلقہ داران اور اودھ اور اہالیان ملک کے خاندان کی یادگاریں بھی نظر آتیں۔ میری ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بلاشبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر میں ارکان کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے، نہایت ظلم اور ناانصافی ہے اور اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں۔ یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی ہے، ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بے ہودہ ڈپلومیسی ہے۔ صاف کہنا چاہیے کہ ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں۔'' (۸)

علامہ مسعود عالم ندوی نے بھی سر سید کے تعلیمی نظریات پر بڑا دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں (سر سید احمد خان) نے اپنی تعلیمی دعوت کے ساتھ انگریزی حضارت و معاشرت کو قبول کرنے کی دعوت کو بھی شامل کر دیا جو سر سید کی بڑی غلطی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے تفسیر قرآن میں اپنی فاسد رائے، تحریف و تاویل اور مغربی فلسفیوں کی اتباع کرتے ہوئے اوامر شریعت کی من مانی تاویل اور باطل ولغو افکار و خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔'' (۹)

اسی طرح کے خیالات کا اظہار سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی کیا، وہ کہتے ہیں: ''انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی، اس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علی گڑھ اور دوسری درس گاہوں میں اختیار کیا گیا، وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریز حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علما نے اس بنا پر نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں پڑھائی جاتی ہے یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے، مگر مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس کی اصل حیثیت رکھتا تھا۔'' (۱۰)

عالم اسلام کے نامور دانشور اور عالم سید ابوالحسن علی ندوی، سر سید کی شخصیت اور ان کی تعلیمی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے متوسط درجہ کی تعلیم پائی تھی اور دینی علوم اور کتاب و سنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے۔ وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جس طرح کوئی مغلوب غالب سے یا کوئی کمزور

طاقت ور سے متاثر ہوتا ہے۔وہ اس تہذیب اور معاشرہ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل ودماغ، اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہوگئیں۔'' (۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ غلامی کے اس دور میں جب کہ مسلمان سیاسی وذہنی قیادت کے خلا سے دوچار تھے سرسید کی شخصیت ابھری اور ایک بادل کی طرح چھا گئی۔ انھوں نے مذہبی معاشرتی مسائل پر مضامین، کتب، رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے علاوہ تعلیم کے فروغ کے لیے بہت بڑا تاریخی کام کیا۔مگر اس ساری تمہید میں ہمیں اس بات کی راہ جواز نہیں ملی کہ ہم سرسید کی نیت پر کوئی شبہ کریں۔وہ اعلیٰ مذہبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے پکے مذہبی آدمی تھے، وہ قابلیت سے مالا مال تھے، ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا۔انھوں نے مسلمانوں کی ترقی اور بالخصوص تعلیم کے فروغ کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی۔

علامہ اقبالؒ کے تعلیمی نظریات

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کسی قوم کے سنورنے اور زوال پذیر ہونے میں تعلیم کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔مزید برآں ملک کی خوش حالی اور ترقی کا راز بھی اس ملک کے طریقہ ہائے تعلیم میں مضمر ہوتا ہے۔تاریخ میں اس حقیقت کی واضح مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی بھی جابر حکمران کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کی آبادی کو اپنے تابع اور مطیع کرسکتا ہے تو اس نے بجائے جبر وتشدد کا راستہ اختیار کرنے کے اس کی آئندہ نسلوں کو مفلوج کیا تھا ان میں وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کی بیخ کنی کردی جائے اس مقصد کے حصول کے لیے نصاب تعلیم کو ان خطوط پر استوار کیا جن سے یہ مقصد حاصل کیا جاسکے۔انگریز نے جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اس نظریہ کو رہنما اصول بتایا اور اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔برصغیر پاک وہند میں لارڈ میکالے نے برطانوی سامراج کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کیں۔اس نے ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا۔جس کی بدولت مسلمانوں کی نئی نسل رفتہ رفتہ اپنی ثقافت اور تہذیب وتمدن سے بے بہرہ ہوگئی ہے۔

علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے تعلیمی نظریات کی توضیح عمومی تصور کے مطابق ان کے اردو کلام سے ہوتی ہے۔اور کہیں کہیں فارسی کے اشعار سے بھی پتا چلتا ہے۔لیکن زیادہ تر نثر میں تعلیم کے متعلق تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔خواجہ غلام السیدین نے اپنی تصنیف ''اقبال کا فلسفہ تعلیم'' میں اقبال کے خطبات، خطوط اور مثنوی کو کئی جگہ تحریر کیا ہے۔جن سے اقبال کے فلسفہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔خاص کر ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں اقبال نے اسلامی نقطہ نگاہ سے تعلیم دینے اور نصاب کو مرتب کرنے پر روشنی ڈالی ہے۔پڑھائی کے دوران اساتذہ اور طلبہ کا آپس میں رشتہ اور بحث ومباحثہ کے جن اصولوں کی وضاحت کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نہ صرف مفکر

تھے بلکہ ماہر تعلیم بھی ہیں۔

چنانچہ علامہ محمد اقبال اردو اور فارسی کے عظیم شاعر اور عظیم مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے تناظر میں ان کے فکر وفن کی خاص اہمیت ہے۔ وہ برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت (دوقومی نظریہ) کے شارح تھے۔ علامہ اقبال نے جو فطرت سے ایک حساس دل لے کر پیدا ہوئے تھے، جب اس خلاء کو محسوس کیا اور نصاب تعلیم کے زہریلے اثر کا اندازہ لگایا تو بے چین ہو گئے۔ انھوں نے خوابیدہ قوم کو منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (۱۲)

اقبال نے کئی ایک مواقع پر تعلیم جدید کی مخالفت کی ہے۔ اقبال ایک ایسے نظام تعلیم کے متمنی تھے جو اچھے با کردار اور بلند نگاہ طالب علم پیدا کرے۔ اقبال جیسے مفکر کے نظریات کو سمجھنے کے لیے قدرے تجزیے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا عقیدہ تو یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ محض عقل کامل نہیں بلکہ اس کے حصول کے لیے ایمان اور وجدان کی بھی ضرورت ہے۔ علم کی غرض و غایت محض مادی زندگی کے فوائد حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ مادی زندگی کی آرائش کے علاوہ داخلی زندگی کی اصلاح اور تربیت بھی ہے۔ اقبال اپنے نظریہ تعلیم میں خودی کی تربیت کو محور بناتے ہیں۔ وہ ایک ایسے نظام پر زور دیتے ہیں جو عقل کی تربیت کے ساتھ ساتھ وجدان اور جذبے کی تربیت کی ضمانت بھی فراہم کرے۔ اسی لیے آپ ایک موقع پر کہتے ہیں:

آہ یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم!
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف (۱۳)

علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات کے حوالے سے نامور دانشور اور سیرت نگار نعیم صدیقی رقمطراز ہیں:

”ہر چند کہ مسئلہ تعلیم پر اقبال کے نظریات اور اصول بہت بڑے وسیع پیمانے پر نثری اور منظوم تحریروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اصل کام یہ ہے کہ ان چیزوں کو سمیٹ کر نہایت خوبصورتی سے واضح کیا جائے کہ اقبال نظام تعلیم کے لیے کیا نظریات دیتے ہیں؟ وہ کیسا نظریہ حیات وکائنات اور کیسا تصور انسان ہمارے سامنے رکھتے ہیں؟ ان کے نزدیک غایت تعلیم کیا ہے؟ وہ اسلامی تصور تعلیم اور جدید مادہ پرستانہ تصور تعلیم کے تضاد کو کس طرح نمایاں کرتے ہیں؟“ (۱۴)

اقبال کے نزدیک وہ علم جو حواس ظاہری اور عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جو باطنی قوت کے ذریعے حاصل کیا جائے دونوں کے درمیان گہرا ربط قائم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مکمل تعلیم وہی ہوسکتی ہے جس میں دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔ اقبال دینی علوم کے حصول کو خودی کی تربیت کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔ دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے چنانچہ اقبال دین میں دنیا کو بھی شامل تصور کرتے ہیں۔ جب کہ جدید طریقہ تعلیم دین اور دنیا کو دو الگ چیزیں سمجھتا

ہے۔اقبال روایات کی تعلیم بہت اہم سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو قومیں اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہیں وہ اپنی قومی حیثیت کو کھو بیٹھتی ہیں۔اقبال ایسے نظام تعلیم کے خواہاں ہیں جو نئی پود میں آفاقی روح پیدا کرے اور ان میں نور بصیرت بھر دے۔وہ نو جوانوں میں ایسی صلاحیتوں کو اجاگر کرے جن کی بدولت تسخیر کائنات مکمل ہو۔

اقبال ایسا نظام چاہتے ہیں جس سے نظر میں بے باکی پیدا ہو۔علامہ چاہتے ہیں کہ ان شاہین بچوں کو ایسے طریقے سے تعلیم دی جائے جس سے ان کے پوشیدہ جوہر اجاگر ہوں اور ان میں جذبہ عمل پیدا ہو۔اقبال کے نزدیک خداوندانِ مکتب پر بہت ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔وہ ایسے معلم پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں جو بلند نگاہ ہوں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔اقبال خود بھی کچھ عرصہ تک معلم کی حیثیت سے اس فرض کو انجام دیتے رہے۔اقبال طالب علم کے سامنے اسلامی تہذیب پیش کرنا چاہتے تھے۔انھوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیاء کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک معلم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خوددار رہو اور مے یقین کے نشے سے سرشار ہو۔علامہ اقبال اپنے طالب علموں کو جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ طلباء سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسلامی جذبے سے سرشار ہوں۔ان کی نظر آفاقی ہو اور جہدِ مسلسل اور حق کے متلاشی ہوں۔وہ دعا گو ہیں:

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے(۱۵)

مجموعی طور علامہ محمد اقبال پر موجود لٹریچر کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال اصطلاحی معنی میں ماہر تعلیم اور نظریاتی اعتبار سے ایک بلند پایہ "تعلیمی مفکر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جن اہم پہلوؤں کی طرف رہنمائی کی ہے ان میں تعلیم کے مقاصد، اساتذہ کا کردار اور ان کی قابلیت، نظام تعلیم کی تنظیم، علم کی مختلف شاخیں اور ان کا باہمی ربط، علم کے اوصاف، طالب علم کی سیرت سازی، درس گاہوں کا ماحول، طلبہ کی انفرادی، اجتماعی، قومی و ملی روایات سے رشتہ، تعلیم کا انفرادی اور اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق، قوم کا اپنا زاویہ نگاہ، ملی نقطہ نگاہ سے دینی تعلیم کی ضرورت اور تعلیم نسواں کے مخصوص خدوخال وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت روز اول سے عیاں ہے کہ تعلیم کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اقبال نے بحث نہ کی ہو۔لہٰذا یہ بات بھی واضح ہے کہ اقبال شعوری طور پر ہمارے فرسودہ نظام تعلیم میں انقلاب و حرکت لانا چاہتے تھے۔اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ نہ تو سرسری طور پر ہے اور نہ برسبیل تذکرہ بلکہ دنیا کے دیگر نظامِ تعلیم کے مطالعہ اور پورے غور و فکر کے بعد ہماری قومی

تعلیم کا نظام مرتب کیا ہے۔اس کے علاوہ ہمارے پیش نظر یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اقبال دورِ اول سے ہی تعلیم کی اہمیت پر غور وفکر کر رہے تھے۔اقبال نے نظام تعلیم مرتب کرتے وقت دنیا کے وسیع تر ماحول کو پیش نظر رکھا۔ان میں معاشروں کی حقیقت،ان کی خصوصیات اور حالات کے جائزے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تعلیمی نظریات

سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳۔۱۹۷۹) ایک نابغہ روزگار ہستی تھے۔وہ احیائے اسلام کے داعی اور مفکر تھے۔انھوں نے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ مذہب سے متنفر لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی اور بھرپور کوشش کرتے ہوئے ٹھوس دلائل سے اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی ثابت کیا۔مولانا مودودی مسلمانوں کی زبوں حالی پر فکر مند تھے اور وہ ہر شعبہ زندگی میں اصلاح کرنا چاہتے تھے۔فکر وعمل کی ساری صلاحیتیں انھوں نے حصول مقصد کی جدوجہد میں صرف کردیں۔ساری زندگی وہ ایک ہی نصب العین کی خاطر سرگرم عمل رہے۔

پروفیسر سید محمد سلیم مولانا کی تعلیم کی ترویج واشاعت کے حوالے سے مولانا کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مولانا مودودی کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان پوری انسانی زندگی پر وسیع ہے۔دینی،علمی،فکری،سیاسی،معاشرتی ہر موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔بعد کے لوگوں نے مختلف شعبوں سے متعلق مولانا مودودی کی سرگرمیوں کے مرقع تیار کیے ہیں۔ان سرگرمیوں کو اجاگر کیا ہے۔ان موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔مگر ان کی دلچسپی اور سرگرمی کا ایک میدان قرار واقعی اہمیت حاصل نہ کرسکا اور وہ ہے تعلیم وتربیت کا شعبہ۔اس موضوع پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔حالانکہ تعلیم سے ان کی دلچسپی کا آغاز بہت پہلے ہوگیا تھا۔''(۱۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم کے ساتھ وابستہ رہے گا۔اپنی تصنیف ''تعلیمات''میں لکھتے ہیں:''اس دنیا میں امامت وقیادت (Leadership) کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے چلتی ہے،کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اس کی پیروی کرتی ہے،کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اس کا اتباع کرتی ہے،کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دنیا ان کے نقش قدم پر ہولیتی ہے اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دنیا اس کی متبع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے،کل اس سے چھین کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے اور برسوں اس سے بھی سلب ہوکر تیسرے کی طرف منتقل ہوجاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اخلاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔''(۱۷)

مولانا مودودی موجودہ دور کے تعلیمی نظام میں خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس حوالے سے رہنمائی کرتے

ہوئے کہتے ہیں: ''میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک (نوجوان) ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، بلکہ بیشتر اصحاب ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہوسکتا ہو۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت انھیں محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا ہماری دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا (Goal) اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہوکر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظام تعلیم کو کس نام سے یاد کروں، جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کرسکے بلکہ زندگی کے لیے کسی نصب العین کی ضرورت محسوس کرسکے۔ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اسے قتل کرنے والی؟'' (۱۸)

مولانا مودودی کے نزدیک تعلیم کا مقصد بڑا واضح ہے۔ اس حوالے سے وہ رہنمائی بھی کرتے ہیں کہ ہمارا مقصدِ تعلیم کیا ہونا چاہیے؟ وہ رقمطراز ہیں: ''ہمارے پیش نظر تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب کو سمجھتے ہوں اور ہماری قومی تہذیب ہمارے دین کے سوا اور کیا ہے؟ لہٰذا وہ ہمارے دین کو اچھی طرح سمجھتے ہوں، اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں، اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اصولوں پر چلاسکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔'' (۱۹)

مولانا مودودی نے جدید مغربی نظام تعلیم پر بھی تنقید کی ہے اور اسلام سے اس کی عدم سازگاری کو پوری طرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''یقیناً انگریز کے سامنے انسانیت کا وہ نقشہ ہرگز نہیں تھا جو مسلمانوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ انگریز نے یہ نظام تعلیم یہاں اس لیے قائم نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کے کلچر کو زندہ رکھے اور ترقی دینے کے لیے کارکن تیار کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اس کے پیش نظر نہیں ہوسکتی۔ پر اس کے پیش نظر انسانیت کا وہ نقشہ بھی نہیں تھا جو خود اپنے ملک انگلستان میں اس کے پیش نظر تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے یہاں آدمی تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ اپنے ملک میں اپنی قوم کے لیے کرتا تھا۔ وہ یہاں ایسے لوگ تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جو ایک آزاد قومی حکومت چلانے کے لیے موزوں ہوں۔ ... پھر اس نظام تعلیم میں جتنے علوم پڑھائے، ان میں اسلام کا کوئی شعبہ نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ خود یورپ میں ان سارے علوم کا جو ارتقا ہوا تھا وہ تمام تر خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی رہنمائی میں ہوا تھا۔'' (۲۰)

مولانا مودودی کے نزدیک مغربی نظام تعلیم کے اثرات سے لوگ دین سے دور ہوجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام تعلیم کے تحت جو لوگ پڑھتے رہے ان کا ذہن قدرتی طور پر بغیر اپنے کسی قصور اور اپنے کسی ارادے کے آپ سے آپ اس طرح بنتا چلا گیا کہ وہ دین سے اور دینی نقطہ نظر سے اور دینی اخلاق سے اور اپنی فکر سے روز بروز بعید تر ہوتے چلے

گئے۔مولانا اس نظام تعلیم کو بنیادی اخلاقی تعلیم سے عاری تعلیم گردانتے ہیں۔وہ کہتے ہیں: ''یہ تعلیم خدا پرستی اور اسلامی اخلاق سے تو خیر خالی ہے ہی،غضب یہ ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں میں وہ بنیادی انسانی اخلاقیات بھی پیدا نہیں کرتی جن کے بغیر کسی قوم کا دنیا میں ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔اس کے زیر اثر پرورش پا کر جو نسلیں اٹھ رہی ہیں وہ مغربی قوموں کے عیوب سے تو ماشاء اللہ پوری طرح آراستہ ہیں مگر ان کی خوبیوں کی چھینٹ تک ان پر نہیں پڑی ہے۔ ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی و جفاکشی، نہ ضبط اوقات، نہ صبر وثبات، نہ عزم واستقلال، نہ باقاعدگی و باضابطگی، نہ ضبط نفس، نہ اپنی ذات سے بالا کسی چیز کی وفاداری، وہ بالکل خودرو درختوں کی طرح ہیں جنھیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی قومی کریکٹر بھی ہے،انھیں معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خور، خویش پرور، سفارشیں کرنے اور سننے والے، بلیک مارکیٹنگ کرنے اور کروانے والے، ناجائز درآمد برآمد کرنے اور کروانے والے، انصاف وقانون اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے، اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کردینے والے، ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں، ہر شعبہ زندگی میں، ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آتے ہیں۔''(۲۱)

ہماری قومی تعلیمی پالیسی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی کہتے ہیں: ''محض کتابیں پڑھانے اور محض علوم وفنون سکھا دینے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ہمیں ان کی ضرورت ہے کہ ہمارے ایک ایک نوجوان کے اندر اسلامی کریکٹر پیدا ہو۔اسلامی طرز فکر اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو، خواہ وہ انجینئر ہو، خواہ وہ سائنٹسٹ ہو، خواہ وہ علوم عمران کا ماہر ہو، خواہ وہ ہماری سول سروس کے لیے تیار ہو رہا ہو، جو بھی ہو اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کریکٹر ضرور ہونا چاہیے۔ یہ چیز ہماری تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہونی چاہیے۔جس آدمی میں اسلامی اخلاق نہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بہرحال ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔''(۲۲)

اسلامی تعلیم کا مقصد بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لیے ایک ایسے طریقے پر تیار کرنا ہے جو اس زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک، سلامتی اور عزت اور برتری کا طریقہ ہے۔اس غرض کے لیے وہ اس کی نظر وفکر درست کرتا ہے، اس کے اخلاق سنوارتا ہے، اس کو سیرت کے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔اس کے لیے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے۔اس کی اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کرکے دیتا ہے۔افراد کی ذہنی اور عملی تربیت وتعدیل کے باب میں اس کے اصول وضوابط سب سے الگ ہیں۔ان کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے۔اور مسلمان قوم کا بحیثیت ایک قوم زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے۔''(۲۳)

مولانا مودودی اپنے مطالعہ اور غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک میں رائج دوہرا نظام تعلیم اس مقصد کے لیے وہ آدمی تیار نہیں کر رہا جو معاشرے میں درکار ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں نظام تعلیم کو ختم کر دیا جائے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ان دونوں نظاموں (قدیم اور جدید) پر تنقید کرنے اور ان کو رد کرنے پر قانع نہیں ہوتے بلکہ انھوں نے مثبت انداز میں صحیح اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال اور نقوش بھی اپنی کتاب ''تعلیمات'' میں پیش کیے ہیں۔

پروفیسر سید محمد سلیمؒ کے تعلیمی نظریات

پروفیسر سید محمد سلیمؒ (۱۵ دسمبر ۱۹۲۳۔۲۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء) کا شمار ایسے اہل علم ودانش میں ہے، جنھوں نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز ''اسلامی نظام تعلیم وتربیت'' کو بنایا اور ''اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل' پر اپنی توجہ صرف کی۔ سید صاحب نے بطور ایک تعلیمی ماہر اپنے منفرد نظریات اور علمی نکات پیش کیے، جو ان کی تصانیف میں موجود ہیں۔ آپ نے زیادہ تر مغربی نظام تعلیم پر لکھا اور مغربی نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم کے ساتھ موازنہ کر کے یہ ثابت کیا کہ حقیقت میں اسلامی نظام تعلیم ہی مکمل اور بہتر نظام تعلیم ہے۔ پروفیسر صاحب کے مطابق اسلام کا نظریہ تعلیم، اسلام کے ضابطہ حیات ہی کا ایک مؤثر حصہ ہے۔ لیکن اپنی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اسلام اپنے نظریے کی وضاحت، حکمت تعلیم کے ذریعے ہی کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم محض سکھانے کا نام نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت یہ ایک معاشرتی عمل ہے۔ معاشرہ جس طرح سے افزائش نسل کی صورت میں اپنا وجودی تسلسل جاری رکھتا ہے اسی طرح وہ تعلیم کے ذریعے اپنا فکری اور ثقافتی تسلسل بھی جاری رکھتا ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم نظریہ تعلیم کی وضاحت یوں کرتے ہیں: ''تعلیم کی جڑیں معاشرہ کے عقائد اور تصور حیات میں پیوست ہوتی ہیں۔ نظریہ حیات کے تناور درخت سے قومی تعلیم کی شاخ پھوٹتی ہے۔ قومی تعلیم کا نظریہ قوم کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے۔'' (۲۴)

پروفیسر صاحب اسلام کے تصور تعلیم اور مغرب کے تصور تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''کسی قوم کا نظام تعلیم اور تصور تعلیم ان عقائد کی بنیاد پر بنتا ہے جس پر اس قوم کی اساس قائم ہے۔ مغربی اقوام کے عقائد ونظریات ان کے نظام تعلیم میں رچ بس گئے ہیں، ان کے نظام تعلیم کو دنیا میں جہاں کہیں نافذ کریں گے، ان کے نظریات وعقائد نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے جائیں گے۔ تصور تعلیم کے سلسلے میں آپ لکھتے ہیں:

''مغرب کی لادینی اور مادی تہذیب کا آج غلبہ ہے۔ اس کے اثرات مسلمانوں پر بھی پڑے ہیں۔ مادی تہذیب میں تعلیم کا مفہوم مختلف علوم وفنون کی معلومات حاصل کرنا ہے۔ ان میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ امتحانات پاس کر کے سند حاصل کرنا ہے تاکہ کوئی اچھی سی نوکری، عمدہ سا روزگار مل سکے۔ جس کے بعد عیش وآرام سے زندگی بسر ہو۔ تعلیم دنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا زینہ ہے۔ اور کامیابی کا مفہوم مادی آرام وآسائش سے زیادہ نہیں۔ ان کے یہاں زندگی

کا تصور خالص مادی ہے۔

مگر اسلام کا تصور تعلیم مغربی تصور تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے کہ اسلام کے نزدیک انسان کا اور زندگی کا تصور مغربی تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اصلاً ایک روحانی مخلوق ہے۔ مادی جسم اس کو اس لیے ملا ہے تاکہ روح اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کر سکے۔ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ ساری مخلوقات میں اعلیٰ اور افضل ہے۔ کارخلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اس کو گوناگوں قسم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جسمانی اور ذہنی بے شمار صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ مقصود انسان کا امتحان لینا ہے کہ انسان اپنے علم کو اپنے اختیار و ارادہ کو اپنی صلاحیتوں کو کس طریقہ پر استعمال کرتا ہے۔ صلاح و خیر کی راہ میں یا شر و فساد کی راہ میں... تعلیم اسلام کے نزدیک انسان کے لیے اسی قدر ضروری ہے جس قدر خورونوش خوراک کے ذریعہ انسان زندگی برقرار رکھتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر انسان کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ تعلیم انسان کو بتاتی ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ انسان کا کام صرف مادی اور حیوانی دریا میں شناوری کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کا اوّل کام اخلاقی و روحانی فضاؤں میں پرواز کرنا ہے۔ اسلام کے نزدیک زندگی گزارنا نہ تو کوئی مجبوری ہے اور نہ عیاشی ہے۔ بلکہ ایک امر حقیقت ہے۔'' (۲۵)

پروفیسر صاحب دنیا کے مختلف خطوں میں رائج مختلف علوم وفنون کی تاریخ اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے اس کو فرض قرار دیا۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

''بلاشبہ اسلام سے قبل دنیا کے بعض خطوں میں علوم وفنون کے چرچے تھے۔ مصر و یونان، چین و روما، ہندو ایران میں مدارس قائم تھے جہاں طالب علم درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مگر سب جگہ ایک بات قدر مشترک نظر آتی ہے۔ عوام علم کی نعمتوں سے بہرہ مند نہیں تھے۔ یونان میں ارسطو جیسا فلسفی اپنی بلند فکری کے باوجود عورتوں اور غلاموں کو علم کی مسند پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہندوستان میں مشہور ماہر قانون ''منو'' شودروں (اچھوتوں) کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر کوئی شودر مقدس کتاب 'وید' کے الفاظ سننے کی کوشش کرے تو اس کے لیے سزا تجویز کرتا ہے کہ اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے۔ یہ تو خیر ہزاروں سال قبل کی باتیں ہیں۔ امریکا کی مہذب دنیا میں مسیح اقوام کا رویہ حبشی آبادی کے ساتھ تعلیم کے معاملہ میں بالکل قدیم دنیا سے مشابہ تھا۔ امریکا کی ریاست جنوبی کیرولینا نے ۱۸۳۴ میں یہ قانون پاس کیا کہ ''اگر کوئی شخص غلاموں (حبشیوں) کو تعلیم دیتے ہوئے یا تعاون کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اگر وہ شخص سفید فام ہے تو اس کو ایک سو ڈالر جرمانہ اور چھ ماہ قید کی سزا دی جائے گی اور اگر وہ کالا ہے تو اس کو پچاس کوڑوں کی سزا

اور پچاس ڈالر جرمانہ ہوگا۔ ہر جگہ ایک طبقہ نے علم کی اجارہ داری قائم کی تھی۔عوام کو اس میں شریک کرنے کے لیے وہ تیار ہی نہیں تھے۔جب کہ قرآن مجید سے قبل کسی آسمانی کتاب میں علم حاصل کرنے کے لیے کوئی حکم نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے علم کی توقیر کی۔اس کے حصول کے لیے ترغیب دلائی۔تحصیل علم کو فرض قرار دیا۔لازمی اور جبری تعلیم کا حکم سب سے پہلے نبی ﷺ نے دیا ہے۔'' (۲۶)

پروفیسر صاحب نے مغربی نظام تعلیم کے اقدار پر بھی بھرپور تنقید کی ہے، آپ لکھتے ہیں: ''مغربی نظام تعلیم بہت سے شعبوں پر مشتمل ہے۔بعض شعبوں میں مفید اور کارآمد طریقے رائج کیے گئے ہیں۔درس و تدریس کے طریقوں سے صرف نظر کر کے ہمارے پیش نظر فی الوقت صرف مقاصد تعلیم پر گفتگو کرنا ہے۔ان اقدار تعلیم پر گفتگو کرنا ہے جو مغربی نظام تعلیم میں بمنزلہ خون رواں دواں ہیں۔ان اقدار کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ان کی واقعی قدر و قیمت متعین کرنا ہے۔اور اس بات کا اندازہ لگانا ہے کہ ان کے اجرا سے مغربی معاشرے کو کتنا فائدہ پہنچا اور کس قدر نقصان۔'' (۲۷)

پروفیسر سید محمد سلیمؒ نے لارڈ میکالے کے نظام تعلیم پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔آپ کہتے ہیں کہ ہر نظام تعلیم کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کی طرف ہر تعلیمی کوشش رہنمائی کرتی ہے۔میکالے کی اسکیم کا واحد مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کو اہل ہند میں فروغ دینا تھا۔اور یہ مقصد اہل مغرب کے نزدیک مذہب جیسا تقدس اختیار کر چکا تھا۔اسی لیے انھوں نے یہاں کے اعلیٰ نظام تعلیم کے بدلنے کی بھرپور کوشش کر کے یہاں کی روایات اسلامی نقطہ نظر پر کاری ضرب لگائی۔جب کہ اسلام کے نزدیک تعلیم کا مقصود ہی اخلاقی تربیت ہے۔اخلاق کی تعلیم اسلامی تعلیم کا لازمی حصہ رہی ہے۔اس سے افراد کے کردار کو پختگی اور معاشرہ کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔جدید تعلیم کے معماروں کے یہاں یہ بات کہاں مطلوب ہوسکتی ہے۔

پروفیسر سید محمد سلیمؒ معاشرے کے کارآمد فرد کی تعلیم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''حقیقی تعلیم انسان کو فکری رخ اور ذہن کو ایک سانچہ مہیا کرتی ہے۔حقیقی تعلیم تطہیر افکار، تعمیر کردار اور اخلاق حسنہ سے عبارت ہے۔انسان جہاں کہیں بھی ہو، اس کو بہرکیف بنیادی انسانی تعلیم کی ضرورت مقدم ہے۔پہلے اس کو نظریہ حیات، اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔دوسرے مرحلے پر فنی اور سائنسی تعلیم دے کر معاشی عامل بنایا جائے۔پھر اس کو عمرانی کارکن بنایا جائے۔اب وہ معاشرہ کی خدمت بہترین طریقہ پر انجام دے گا۔'' (۲۸)

پروفیسر سید محمد سلیم نے اپنے لٹریچر میں مغربی تہذیب کی خرابی اور خوبیوں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے ان وجوہات کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی وجہ سے مسلمان مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کی مخالفت کرتے ہیں۔پروفیسر صاحب کے نزدیک مغربی تہذیب کا سب سے روشن پہلو سائنس کی ایجادات اور اختراعات کا پہلو ہے۔ان ایجادات نے زندگی میں سہولت اور آرام مہیا کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں بہت سے امراض پر قابو پا لیا گیا ہے۔شرح اموات کم ہوگئی ہے۔

زندگی آرام دہ بن گئی ہے۔ انسان آج ہوا میں اڑ رہا ہے اور چاند پر جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ مغربی تہذیب کا یہ پہلو نہایت تابناک ہے۔ جب کہ اسی طرح اس کی خامیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ سائنسی ایجادات واختراعات کا دوسرا رخ بھی ہے۔ یہ انتہائی تباہ کن اور ہلاکت آفرین پہلو ہے۔ یہ مہلک ترین ہتھیاروں، میزائلوں، ذراتی بم، جوہری بم کا پہلو ہے۔ ان کی وجہ سے بھرے شہر چشم زدن میں تباہ اور غارت کیے جاسکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لاکھوں انسان لقمہ اجل بن سکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک مغربی تہذیب کا ایک نمایاں پہلو اہل مغرب کی نسلی برتری کا تصور ہے۔ سفید فام ہونے کا مطلب اہل مغرب یہ لیتے ہیں کہ وہ رنگ دار نسلوں سے پیدائشی طور پر برتر اور فاضل تر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں آزاد شہوت رانی کا نظریہ مقبول عام ہے۔ انسان حیوانی سطح پر اتر آئے ہیں۔

پروفیسر سید محمد سلیمؒ برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کی علم دوستی اور علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں ان کے کارناموں کے قدردان ہیں۔ آپ نے اس سلسلے میں کئی واقعات درج کیے ہیں، مگر طوالت کے سبب ہم یہاں پر صرف والی میسر کے عظیم حکمران ٹیپو سلطان کی علم دوستی اور مغربی علوم وفنون کے لیے کی گئی کوششوں کے حوالے سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

> ''سلطان نے مغربی علوم وفنون کی تحصیل کے لیے ایک جدید انداز کی تعلیم گاہ قائم کی۔ اس کا نام جمیع الامور رکھا۔ گمان یہ ہے کہ جمیع الامور، یونیورسٹی کا ترجمہ ہے۔ اس جامعہ میں فرانسیسی اہل علم کو بطور استاد مقرر کیا گیا تھا۔ اس جامعہ کے ساتھ مغربی علوم کے ترجمہ کا ایک شعبہ تھا۔ چند کتابوں کا یہاں ترجمہ کیا گیا۔ سلطان ٹیپو کی ایک عالی شان لائبریری تھی۔ جس میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ صرف ایک نادر الوجود قرآن، جید قصرِ شاہی ونڈسر لندن میں بھیجا گیا۔ بقیہ کتب فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منتقل کردی گئیں۔ چارلس اسٹوارٹ کو ان کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ اس نے سرکاری ملازمت ترک کرکے اپنی ذاتی حیثیت سے فہرست تیار کی۔ سرکاری منشی بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ صرف مولوی حسین علی نے آخر وقت تک ساتھ دیا۔ سلطان کی شہادت کے بعد قلعہ شاہی پر برطانوی افواج نے قبضہ کرلیا۔ یہ لائبریری بھی قبضہ میں آئی۔''(۲۹)

پروفیسر صاحب تعلیم میں استاد کی اہمیت اور اس کے کردار کو بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اساتذہ کے مثالی کردار اور طریقہ درس وتدریس کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں: ''ہر صاحبِ علم تحریک اشاعت علم کا سرگرم کارکن بن جاتا تھا۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد عالم پر اشاعت علم کی ذمہ داری عائد ہوجاتی تھی۔ وہ استاد بن جاتا تھا۔ مسند تدریس بچھا کر وہ طلبہ کو تعلیم دینا شروع کردیتا تھا۔ مسجد کے کسی کونہ میں کسی ستون کے سہارے وہ اپنا حلقہ تدریس قائم کرلیتا تھا۔ شوقین طلبہ حلقہ بنا کر اس کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ اس طرح درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوجاتا تھا۔ افادہ علم کے لیے اسباب ووسائل

کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کسی میز کرسی، انتظامیہ وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مسجد کا صحن بیٹھنے کے لیے کافی تھا۔ مسجد کا ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ بعض لوگ اپنے گھر کے دروازے پر، اپنی دکان پر، اپنے کارخانہ میں تعلیم دیتے تھے۔ ناسازگار حالات میں جیل کی کوٹھڑی اور اندھے کنوئیں کی منڈیر بھی درس گاہ کا کام دیتی تھی۔" (۳۰)

پروفیسر سید محمد سلیم دورنبوی ﷺ کے نصاب تعلیم بھی بتاتے ہیں، آپ لکھتے ہیں: "نصاب تعلیم کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف اوقات میں واضح ارشادات فرمائے ہیں۔ ان ارشادات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں درج ذیل علوم اور امور کی تعلیم دی جاتی تھی: ۱۔قرآن مجید، احادیث، فقہ۔ نصاب کا دینی حصہ تھا۔۲۔علم فرائض، طب، نجوم، غیر ملکی زبانیں۔ یہ نصاب کا دنیوی حصہ تھا۔۳۔آپؐ نے ورزش، تیراکی اور تیراندازی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ یہ جسمانی تربیت کا حصہ تھا۔" (۳۱)

پروفیسر صاحب کے نزدیک اسلام سے قبل دنیا علم کی روشنی سے اتنی منور نہ تھی جتنی اسلامی دور میں ہوئی۔ مسلمانوں نے جہاں جہاں حکومت کی وہاں مکتب، مدرسے اور مسجدیں قائم کیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام نے تعلیم کا مقصد مالی منفعت کے بجائے ثواب قرار دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے لٹریچر میں مسلمانوں کے سنہرے تعلیمی دور کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں طلبہ حصول علم کا بے پناہ شوق رکھتے تھے، اساتذہ بلا معاوضہ تعلیم دیتے تھے، علما جیل خانے میں بھی مضطرب رہ کر تعلیم دیتے رہے۔ نظام الملک طوسی خود گھر پر رہ کر تعلیم دیتا تھا، امام مالک اور امام ابوحنیفہ تیس سال تک تعلیم دیتے رہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اس دور میں تعلیم میں سیاست کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ دینی تعلیم کو رائج کرنا بادشاہ وقت کا فرض تھا۔ تعلیم امیر اور غریب کو مفت اور مساوی بنیادوں پر دی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں تعلیمی دنیا جو یورپ کے بے دین تعلیمی ماہرین کے نظریات سے گمراہ ہو رہی ہے اور اسلامی نظام تعلیم کے نام سے بے گانہ ہے، وہ پروفیسر سید محمد سلیم کی کتابوں، علمی مقالات کے مطالعے اور تعلیمی نظریات سے استفادہ کر کے نئی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

خلاصہ بحث

مجموعی طور اگر درج بالا بحث پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم برصغیر کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین ومذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے، کیوں کہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پا لیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کر لیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ

اقوام اپنے قومی خصائص و روایات اور ملی شعائر و علامات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیتی ہیں، بلکہ ایک مدت تک عمل تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ ان سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اب ان کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلیدی سرمایہ افتخار رہ جاتی ہے۔ برصغیر کے بیدار مغز مسلمان ارباب فکر و علم نے اس خطرہ کا اسی وقت احساس کر لیا اور اس کا سد باب کرنے کے لیے انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان ارباب کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، کیوں کہ سیاسی طاقت وقوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب و محکوم ہونے کے باوجود زندہ رہ سکتے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود ارباب فکر میں دو طبقے ہو گئے۔ ایک طبقہ جو علمائے کرام کا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعے دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق بعض اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج کل عام اصطلاح میں اس طبقے کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ گروہ علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا طبقہ مجددین کا تھا، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم و فنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال، وضع قطع اور فکر و دماغ کے اعتبار سے علما کے گروہ کی ضد ہیں۔ بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک قدیم، دوسری جدید۔ ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درس گاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں۔ تعلیم جدید کی درس گاہیں 'اسکول اور کالج' کہلائیں اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام بھی وہی پرانا 'مدرسہ' رہا۔ اگر چہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور ان کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کا تصور تعلیم اور مسلم مفکرین کی رائے دوسری قوموں کے تصور تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ دوسری قوموں کے نزدیک تعلیم بہتر زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ ہے۔ حصول روزگار کے لیے ایک راستہ ہے، ایک پیشہ ہے اور ایک کاروبار ہے۔ اصل مقصود مادی سہولتیں اور آسائشیں ہیں، جن کو تعلیم کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں تدریسی تعلیم ہو یا تلقینی تعلیم، یا وعظ و نصیحت ہو، ان میں سے کوئی بھی نہ کاروبار ہے اور نہ پیشہ ہے بلکہ کار عبادت ہے۔ درس و تدریس میں مشغول استاد اور طالب علم کا مقصود نہ حصول منفعت ہے، نہ حصول جاہ ہے، بلکہ حصول رضائے الٰہی ہے، حصول اجر و ثواب ہے، حصول آخرت ہے۔ اس وجہ سے بے غرضی اور

بے لوثی اسلامی نظام تعلیم کا خاص شعار ہے۔ لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ برصغیر کے نامور مسلم مفکرین نے ایسے تعلیمی نظریات وضع کیے جن سے لوگوں میں ایک فکر اور سوچ پیدا ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آگے چل کے اس خطے میں ایک حقیقی تبدیلی رونما ہوئی۔ اور اس تبدیلی کے پیچھے ان مفکرین کے وہ نظریات تھے جن سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

علاوہ ازیں، ان مسلم مفکرین کے نظریات کی روشنی میں عصر حاضر کے درپیش چیلنجز کا بھی مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ آج کے دور کے مسائل اور ان کا حل ان تعلیمی نظریات میں پنہاں ہے۔ اگر تحقیق، جستجو، غور و فکر کریں تو آج ہمیں جس اہم چیلنج کا سامنا ہے وہ ایک ہمہ گیر قسم کا فکری چیلنج ہے۔ جس کا مقابلہ صرف اور صرف مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ معیشت، تجارت، ثقافت اور علم سائنس و حرفت کی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس حوالے سے بھی مسلم محققین کو رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ طوالت کے سبب یہاں پر چند مسلم مفکرین کے نظریات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، لیکن اور بھی بہت سی ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے اس میدان میں نمایاں کام کیا ہے۔

مراجع و حواشی

(۱) محمد اکرام، شیخ (۲۰۰۱ء)، رود کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۶۴۷

(۲) محمد سلیم، سید، پروفیسر (س۔ن)، تاریخ نظریہ پاکستان، لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، ص ۶۴۷

(۳) ایضاً، ص ۶۰۷

(۴) محمد اکرام، شیخ (۲۰۰۳ء)، موج کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۸۴

(۵) پانی پتی، جمال، سرسید کا نظام تعلیم اور ہم، فرائیڈے اسپیشل، ص ۱۷، روزنامہ جسارت ۳ تا ۹ اپریل ۱۹۹۸ء

(۶) صدیقی، نعیم (۲۰۰۹ء)، تعلیم کا تہذیبی نظریہ، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ص ۲۹۰۔۲۹۱

(۷) محمد اکرام، شیخ، بحوالہ بالا، ص ۲۲۸

(۸) لاہوری، ضیاء الدین (۲۰۰۷ء)، سرسید اور ان کی تحریک، لاہور: جمعیت پبلی کیشنز، ص ۲۳

(۹) ایضاً، ص ۶۳

(۱۰) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید (۱۳۵۶ھ) حیدرآباد دکن: ترجمان القرآن، ص ۲۰۲، بحوالہ ادبیات مودودی

(۱۱) لاہوری، ضیاء الدین، بحوالہ بالا، ص ۴۷

(۱۲) محمد اقبال، ڈاکٹر (س۔ن)، کلیات اقبال، بال جبریل، لاہور: المیزان ناشران و تاجران کتب، ص ۳۲۰

(۱۳) ایضاً، ص ۳۴۶

(۱۴) صدیقی، نعیم، بحوالہ بالا، ص ۲۹۴

(۱۵) محمد اقبال، ڈاکٹر، بحوالہ بالا، ص ۲۳۲

(۱۶) جماعت اسلامی تعلیم کے میدان میں، اسلامی نظامت تعلیم لاہور، ص ۵

(۱۷) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید(۲۰۱۰ء)، تعلیمات، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ص ۵۰

(۱۸) ایضاً، ص۴۵

(۱۹) ایضاً، ص۱۰۳

(۲۰) ایضاً، ص۱۳۰۔۱۳۱

(۲۱) ایضاً، ص۱۳۴

(۲۲) ایضاً، ص۱۰۵

(۲۳) ایضاً، ص۳۱

(۲۴) محمد سلیم، سید، پروفیسر (س۔ن)، اسلام کا نظریہ حیات، لاہور: البدر پبلی کیشنز، ص ۶

(۲۵) محمد سلیم، سید، پروفیسر (۱۹۸۹ء)، اسلامی تعلیم بنیادی تصورات وافکار، لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، ص ۶۷

(۲۶) محمد سلیم، سید، پروفیسر (س۔ن)، آغاز اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، ص۵

(۲۷) مغربی فلسفہ تعلیم ایک تنقیدی مطالعہ، کراچی: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۰۸/محرم الحرام ۱۴۲۹ھ، ص۱۲۳

(۲۸) ایضاً، ص۱۷۴

(۲۹) محمد سلیم سید، پروفیسر (۱۹۹۳ء)، مغربی زبانوں کے ماہر علما، لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، ص ۳۹

(۳۰) محمد سلیم، سید، پروفیسر (۲۰۰۸ء)، مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ، اشاعت سوم، کراچی: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ص۲۱

(۳۱) محمد سلیم، سید، پروفیسر (۱۹۹۳ء)، دینی مدارس کے لیے نصاب نو کی تجاویز، لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، ص ۸